سیاسی جماعتیں اور اسلام کا سیاسی نظام

جناب محمد امین صاحب ریاض یونیورسٹی

(۲)

اس رُخ سے بحث کے بعد کہ سیاسی جماعتوں کا نظام من حیث الاصل جن مبادی پر قائم ہے وہ سارے مبادی اسلام میں بھی موجود ہیں۔ اب ہم ایجابی طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ کیا ادلہ شرعیہ کی رُو سے بھی ان اہداف کے لیے جماعت سازی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں جن ادلہ شرعیہ اور قواعد کلیہ سے ہماری بات کی تصدیق ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ قرآن
۲۔ سنّت
۳۔ مذہب الصحابی
۴۔ مقاصد الشریعہ
۵۔ مصالح مرسلہ
۶۔ قاعدہ اخف الضررین

اب ہم مختصر طور پر ان ادلہ شرعیہ پر بحث کریں گے۔

پہلی اور دوسری دلیل : قرآن وسنّت

قرآن وسنّت کی تعلیمات جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اختلاف رائے کو جائز ٹھہراتی ہیں، بلکہ بعض اوقات اس پر اُکساتی ہیں۔ یہی حال جماعت سازی کا ہے کہ قرآن وسنت کی رُو سے امورِ خیر

کے لیے قوت مجتمع کرنا اور جدوجہد کرنا عین مطلوب اور محمود ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ قرآن و سنّت نے جس سیاسی نظام کا ڈھانچہ دیا ہے اس پر موجودہ زمانے میں عمل ہو ہی نہیں سکتا اگر سیاسی جماعتوں کا نظام نہ ہو مثلاً قرآن و سنّت میں شوریٰ کا حکم آیا ہے[1] اب شوریٰ کا تصور ہی ناممکن ہے جب تک معاشرے میں آزادیٔ رائے نہ ہو، عوام کو حکمرانوں کے احتساب کی اجازت نہ ہو، اور جب تک مجلس شوریٰ میں عوام کے صحیح نمائندے جو اس کے اہل بھی ہوں موجود نہ ہوں۔ لیکن اگر ہم آج کے حالات کا جائزہ لیں کہ آبادی کا پھیلاؤ کتنا بڑھ گیا ہے، زندگی پیچیدہ ہوگئی ہے، عوام کے مسائل بہت زیادہ ہیں۔ حکومتی نظم و نسق ایک گورکھ دھندا ہے تو ان حالات میں بھلا ایک اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے۔ جب تک کہ ایک جماعت نہ ہو جس کے پاس مادی اور انسانی وسائل ہوں جس کے پاس مسائل کا تجزیہ کرنے اور ان کا حل سوچنے کی ایک مشینری ہو جو عوام تک پہنچے ان کی کمیٹیاں اور انجمنیں بنوائے، تقریروں، جلسوں، پمفلٹوں، پوسٹروں اور مضامین و مقالات کے ذریعے رائے عامہ کو منظم کرے تو پھر کہیں جا کر شوریٰ پر عمل کرنے کی کوئی صورت سامنے آئے گی جو حقیقی اور بامقصد ہوگی۔

اسی طرح قرآن و سنت میں عدل و مساوات کا حکم آتا ہے[2] جس کا مقصود یہ ہے کہ عدل و مساوات

---

[1] فبما رحمة من الله لنت لهم، ولو كنت فظاً غليظ القلب لانفضوا من حولك، فاعف عنهم، واستغفر لهم، وشاورهم في الامر، فاذا عزمت فتوكل على الله، ان الله يحب المتوكلين (آل عمران - ۱۵۹)

والذين استجابوا لربهم واقاموا الصلاة وامرهم شورىٰ بينهم ومما رزقنٰهم ينفقون (الشوری - ۳۸)

[2] ان الله يامركم بالعدل والاحسان (النحل - ۹۰)

— ولا يجرمنكم شنآن قوم على الا تعدلوا (المائدة - ۸)

— واذا قلتم فاعدلوا ولو كان ذا قربىٰ (الانعام - ۱۵۲)

— يايها الناس انا خلقناكم من ذكر وانثى وجعلناكم شعوباً (باقی بر صفحہ آئندہ)

کی یہ روح زندگی کے ہر شعبے میں (بشمول سیاسی زندگی) سرایت کیے ہوئے ہو، اب کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں نظامِ حکومت وراثتی ملکیت پر مبنی ہو یا جہاں فوجی یا سول ڈکٹیٹرشپ مسلط ہو اور وہ عوام کے سامنے جواب دہ ہو اور نہ اس کے کسی ادارے کے سامنے، نہ عوام نے انہیں چنا ہو اور نہ عوام انہیں اپنی مرضی سے کرسی سے اُتار سکتے ہوں اور نہ حکمرانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (الحجرات-۱۳)

وفیہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم

— "ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ واقربھم منہ مجلساً امام عادل وان ابغض الناس الی اللہ یوم القیامۃ واشدھم عذاباً امام جائر"۔

(مسند احمد بن حنبل جلد سوم ص ۲۲ المکتب الاسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ)

— "لا فضل لعربی علی عجمی، ولا لعجمی علی عربی، ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی الاحمر الا بالتقویٰ"۔ (مسند احمد بن حنبل جلد پنجم صفحہ ۴۱۱، مرجع سابق)

— "یا بنی ھاشم، لا یجیئنی الناس بالاعمال وتجیئونی بالانساب۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"۔

— "انما اھلک الذین من قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ وان سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد، والذی نفس محمد بیدہ، لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا"۔

(البخاری جلد چہارم ص ۲۱۳ طبع استانبول ۱۴۰۱ھ)

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:۔

— "ما ندم من استشار ولا خاب من استخار"۔

— "واستعینوا علی امورکم بالمشاورۃ"۔

— "ما استغنی مستبد برائہ وما ھلک احد من مشورۃ"۔

کو خدا کا خوف ہو، بلکہ وہ اپنی مرضی سے اور اپنے حواریوں کی وساطت سے جو چاہیں کریں اور جس کو چاہیں نوازیں۔ اِن حالات میں کیا اسلامی تصور کے مطابق عدل وانصاف کا دَور دورہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی ایک آدمی یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ اسلام کے تصورِ عدل ومساوات کو نافذ کیا جائے اور اگر کوئی یہ کوشش کر بھی دیکھے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام اجتماعی جدوجہد کا متقاضی ہے جس کی ایک صورت سیاسی جماعتوں کا نظام ہے۔ اس طرح قرآن و سنّت نے آزادی کی ضمانت دی ہے[1] جس میں سیاسی آزادی بھی شامل ہے لیکن کیا کسی مستبد فوجی یا شاہی نظام میں ایک عام آدمی ظالم حاکم کے سامنے سچی بات کہنے کی جراٴت کر سکتا ہے؟ اور اگر کر بھی لے تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اگر سچی بات کہنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو شارع نے اس کا حکم عبث تو نہیں دیا تھا۔ آج سچی بات کہنے کا کوئی اثر اور نتیجہ تو تبھی ہو سکتا ہے جب اس کے پیچھے تنظیم کی قوت ہو۔ رسائل وجرائد، تقریروں، خطبوں، جلسوں وغیرہ کے ذریعے حق بات پہنچائی جائے اور پھر اس کے اثرات کو سمیٹا جائے۔ غرض قرآن و سنّت کے دیے ہوئے سیاسی ڈھانچے پر صحیح معنوں میں عمل ہو ہی نہیں سکتا جب تک سیاسی جماعتوں کا نظام موجود اور فعال نہ ہو۔

تیسری دلیل: مذہب الصحابی

خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام کے عمل سے بھی سیاسی اختلاف بلکہ سیاسی دھڑے بندیوں اور گروہوں کا پتہ چلتا ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں گروہ انصار کا اپنی سیاسی

---

[1] قولہ تعالیٰ:۔ "ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینہون عن المنکر" (آل عمران - ۱۰۴)

وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم،

"افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر"

(سنن ابی داؤد جلد چہارم ص ۵۱۴ - طبع استانبول - ۱۴۰۱ھ)

آراء پر انحصار، اور مہاجرین کا بالعکس نقطہ نظر رکھنا اس کی ایک مثال ہے۔[1] حضرت علیؓ اور معاویہؓ کا اختلاف اور جنگیں اور حضرت علیؓ و عائشہؓ و طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کا اختلاف کیا سیاسی نہ تھا؟ اور کیا ان میں سے ہر ایک کو عوام کے ایک طبقے کی حمایت حاصل نہ تھی جو اُن کے خیالات کی حمایت کرتا تھا اور ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کرتا تھا، اور کیا یہی وہ کام نہیں ہے جو آج سیاسی جماعتیں کرتی ہیں؟[2]

---

۱ مشہور مصری عالم اور مؤرخ ڈاکٹر ضیاء الدین ریس کہتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کا ظہور حضرت علیؓ کے زمانے میں ہوا۔ اور وہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے گروہوں کو سیاسی جماعتیں قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "النظریات السیاسیہ الاسلامیہ" ص ۵۸ وما بعدھا۔ الطبعہ السابعہ ۱۹۷۹ء مکتبہ دارالتراث بالقاہرہ۔

۲ بعض حضرات کا خیال ہے کہ صحابہ کرام میں سیاسی اختلاف موجود تھا لیکن اُن کے اختلاف کو سیاسی جماعتوں پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کی اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے، کیونکہ آخر سیاسی جماعتیں کیا ہوتی ہیں؟ یہی کہ لوگوں کے درمیان سیاسی اُمور پر اختلاف ہو، لوگوں کا ایک گروہ یا طبقہ ایک خاص نقطہ نظر کی حمایت کرے اور دوسرے کی مخالفت، پھر ہر گروہ یہ سمجھے کہ وہ اقتدار کا زیادہ حق دار ہے۔ اور حکمران گروہ کے ناجائز کاموں پر ان کی مخالفت کی جائے، ایک سیاسی جماعت میں آخر یہی چار عناصر تو ہوتے ہیں۔ اور یہی چار عناصر صحابہ کرام کے گروہی اختلاف میں موجود تھے؟ پھر آخر کیا ہم ان سیاسی گروہوں اور جماعتوں کے وجود کا صرف اس لیے انکار کر دیں گے کہ اُن کے نام کے ساتھ کسی سیاسی جماعت کا لاحقہ نہ تھا؟ یا ان جماعتوں کا کوئی تحریری دستور اور شعار نہ تھا؟ اور یہ بھول جائیں گے کہ گروہ بندی کی شکل، کیفیت اور طریق کار کا تعلق تو تمدنی اُمور سے ہے اور اُن کی شکلیں تو زمانے اور ماحول کے بدلنے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں، اگر صحابہ کرام آج کے زمانے میں ہوتے تو زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اُن کے ہر گروہ کا ایک نام ہوتا اور دستور اور جھنڈا ہوتا، لہٰذا ان شکلی اُمور میں اختلاف کی بنیاد پر ہم ایک واضح حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے۔

صحابہؓ میں دستوری حدود کے اندر سیاسی اختلاف کی نمایاں ترین مثال غالباً حضرت علیؓ اور خوارج کی ہے۔ واقعہ تحکیم کے بعد خوارج نے ایک گروہ بنا لیا۔ اور وہ حضرت علیؓ کی رو در رو مخالفت کرتے تھے۔ مساجد کے خطبوں میں اُن کو ٹوک دیتے تھے، بد کلامی کرتے اور قتل کی دھمکیاں دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت علیؓ نے اُن کو جیلوں میں نہیں ڈالا، اُن کی زبان بندی نہیں کی اور اُس وقت تک اُن کے خلاف تلوار نہیں اُٹھائی جب تک کہ انہوں نے پہل نہیں کی۔ اس بارے میں اُن کا مشہور قول ہے کہ انہوں نے فرمایا "ہم تمہارے ساتھ جنگ کرنے میں پہل نہیں کریں گے، تم کو مسجدوں میں آنے سے نہیں روکیں گے اور جب تک تم ہمارے ساتھ ہو تمہیں فئ میں سے حصہ دیتے رہیں گے"۔[1]

چوتھی دلیل: مقاصد الشریعہ۔

اِس دلیل کا ماحصل یہ ہے کہ شارع نے ہمیں کسی فعل کا حکم بے مقصد نہیں دیا بلکہ ہر حکم کے پیچھے، خواہ وہ نصِ قرآن پر مبنی ہو یا سنّت پر، مصلحت و منفعت اور حکمت و مقاصد موجود ہوتے ہیں، خصوصاً اُن نصوص میں جو مجمل ہیں اور جن کا تعلّق ایسے معاملات سے ہے جن میں کوئی تفصیلی اور جامد حکم دینا شارع کی حکمت کے اس لیے خلاف ہے کہ اس طرح آنے والی نسلیں ضیق اور حرج میں مبتلا ہو جائیں گی۔ نیز یہ امر شریعت کے دوام اور اس کی عظمت کے بھی خلاف ہے اس لیے ایسے اُمور میں شارع نے ان مقاصد کا ذکر کر دیا ہے، جو اُسے مطلوب ہیں اور تفصیلات کا تعیّن خود اُمت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات و واقعات کے مطابق اس کا تعین کر لے۔

مثلاً قرآن و سنّت "شوریٰ" پر زور دیتے ہیں۔ سیاسی شعبے میں اس کا واضح اور سادہ مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے بننے اور اس کے سربراہ کے چناؤ میں عوام الناس سے مشاورت کی جائے، حکومتی معاملات میں عوام سے مشورے کا اہتمام کیا جائے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہیں انہیں اس کی آزادی ہو وغیرہ وغیرہ، اب جو سیاسی ڈھانچہ ان باتوں کی اجازت نہیں دیتا وہ غیر اسلامی ہے۔ خواہ اس کی شکل کچھ بھی ہو، اسی طرح ہر وہ ڈھانچہ اور نظام جو ایک حقیقی اور شورائی رُوح کا اہتمام کرنے میں کامیاب ہو

---

[1] الفرق بین الفرق، عبدالقاہر البغدادی، ص ۱۴، مکتب نشر الثقافۃ الاسلامیہ بمصر، ۱۳۶۷ھ

وہ عین اسلامی ہے خواہ اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ کیونکہ جس امر میں نص وارد ہوئی ہے وہ خاص شکل نہیں بلکہ بعض اہداف و مقاصد ہیں، اس کی ایک مثال انتخابات کا نظام ہے جو مغرب کے جمہوری نظام کا ایک حصہ ہے، اور جیسے وہاں حکام اور ان کے نمائندوں کے انتخاب کے لیے عامۃ الناس کی رائے جاننے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسلام کے سیاسی نظام میں شوریٰ کے اُصول کا مطالبہ یہ ہے کہ حکمرانوں کا انتخاب عوام کے مشورے سے ہو۔ اب اگر ہم عوام سے مشورہ کرنے کے لیے، ان کی رائے جاننے کے لیے انتخابات کے اس نظام کو اپنالیں (اور ان تفصیلات سے گریز کریں جو مغرب نے اپنے حالات و ضروریات کے تحت اپنا رکھی ہیں۔ بلکہ اس کا تفصیلی ڈھانچہ اپنی ضروریات کے مطابق ہم خود بنالیں) تاکہ شوریٰ کے قرآنی حکم پر عمل ہو سکے تو اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات سو فیصدی مقبول ہوگی کیونکہ اس سے شریعت کے منصوص مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اس بات کے علی الرغم کہ انتخابات کا یہ نظام مغرب کے جس جمہوری نظام کا ایک حصہ ہے وہ نظام سراسر غیر اسلامی ہے اور غلط بنیادوں پر قائم ہے۔

تو ہماری اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کے بعض متعین اور منصوص مقاصد ہیں (مثلاً شوریٰ، آزادیٔ رائے، عدل و مساوات، بنیادی حقوق وغیرہ) خلفائے راشدین نے جو سیاسی ڈھانچہ بنایا تھا۔ اور جو تفصیلات طے کی تھیں وہ ان مقاصد کو پورا کرتی تھیں اور ان کے حالات اور رسم و رواج اور ضروریات کے مطابق تھیں۔ اس لیے ان کا تیار کردہ ڈھانچہ عین اسلامی تھا۔ اور آج ہم اگر ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک سیاسی ڈھانچہ بنائیں اور اس کی تفصیلات کا تعین اپنے موجودہ رسم و رواج اور عصری حالات و ضروریات کے مطابق کریں تو یہ ڈھانچہ بھی عین اسلامی ہوگا، خواہ اپنی شکلی صورت میں اور تفصیلات کے تعین میں صحابہ کرام کے سیاسی نظام اور ڈھانچے سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، بشرطیکہ اس سے شریعت کے مذکورہ منصوص اہداف پورے ہوتے ہوں۔

اور جیسا کہ ہم اس سے پہلے مثالیں دے کر بیان کر چکے ہیں کہ موجودہ حالات میں اسلام کے سیاسی نظام کے اہداف پر عمل ہو ہی نہیں سکتا، جب تک سیاسی جماعتوں کا نظام نہ ہو کیونکہ اس نظام کے بغیر، موجودہ حالات میں، عوام کی فعال شرکت اور مشاورت کی اور کوئی صورت ممکن نہیں،

نہ اس کے بغیر بنیادی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ عدل و مساوات کے اہداف حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ تو مقاصد الشریعہ کی اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں شارع نے جو اہداف متعین فرمائے ہیں موجودہ زمانے میں ان کا حصول ناممکن ہے، جب تک سیاسی جماعتیں نہ ہوں۔ لہٰذا سیاسی جماعتوں کا وجود اور ان کے وجود پر مبنی نظام عین اسلامی ہے۔

پانچویں دلیل: مصالح مرسلہ۔

مصالح مرسلہ کا مطلب ہے وہ مصالح جن کے اثبات یا نفی میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی[1] لیکن ان سے مسلمانوں کے دینی اور دنیوی مفادات وابستہ ہیں تو ان مصالح کی ایک شرعی حیثیت ہوگی، خصوصاً اگر یہ "ضروری" ہوں اور "قطعی" اور "عام" بھی[2]۔ صحابہ کرام اور سلف صالحین نے مصالح مرسلہ کی بنیاد پر بہت سے عظیم فیصلے کیے ہیں مثلاً قرآن کا جمع کرنا، خراج کا تعین، جیلوں کا قیام، تین طلاقوں کا نفاذ وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح عصر حاضر میں مصالح مرسلہ کی بنیاد پر سیاسی اداروں کے بارے میں فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اسلام کے سیاسی نظام میں انتقال اقتدار کے لیے ایک ایسے ڈھانچے اور ادارے کی ضرورت ہے جو اس کے سیاسی تصورات سے میل کھاتا ہو اور ماضی کی کمزوریوں اور غلطیوں سے بھی پاک ہو، کیونکہ ایسے ایک ادارے کا عدم وجود مسلمانوں میں قتل و خون ریزی کا سبب بنتا ہے لہٰذا ایسے کسی نظام اور ادارے کا قیام مسلمانوں کے نہایت ضروری اور بنیادی مسائل میں سے ہے۔

اور جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ موجودہ دور میں سیاسی جماعتوں کا نظام وہ واحد نظام ہے جو انتخابات کے ذریعے، دستوری ذرائع کے مطابق پر امن طور پر انتقالِ اقتدار کا ایک ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سے عوام کی سیاسی تربیت ہوتی ہے، سیاسی جدوجہد کے ذریعے تجربہ کار سیاسی قیادت پروان چڑھتی ہے، اس کے علاوہ امن و امان کی بحالی، دفعِ استبداد

[1] و [2] المستصفیٰ الغزالی، جلد اوّل ص ۲۰۶ طبع دار صادر عن طبع بولاق

ارشاد الفحول، الشوکانی، ص ۲۴۶ طبع دار المعرفہ بیروت ۱۳۹۹ھ

ظلم اور حصولِ بنیادی حقوق میں سیاسی جماعتوں کا کردار مسلمانوں کے متعدد دینی اور دنیوی مصالح کا ضامن ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم مصالح مرسلہ کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے غور کریں تو بھی سیاسی جماعتوں کا نظام انتہائی ضروری اور مفید ہے اور اس لحاظ سے شرعی طور پر جائز بھی۔

چھٹی دلیل: اخف الضررین کا قاعدہ۔

"اخف الضررین" یا "اھون البلیتین" اصول فقہ کا ایک مستقل قاعدہ کلیہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی ایسی صورتِ حال سے واسطہ پڑ جائے۔ جہاں دونوں صورتیں شریعت کے خلاف ہوں اور دونوں میں سے کسی ایک کا اختیار کرنا ضروری ہو تو ایسے موقع پر آسان اور ہلکی معصیت کو ترجیح دی جائے گی[۱]۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس قاعدہ کا اطلاق سیاسی جماعتوں پر کیسے ہوتا ہے؟

اس وقت ہمارے ہاں دو طرح کی سیاسی جماعتیں ہیں ایک وہ جو دین و سیاست میں تفریق نہیں کرتیں[۲] اور جو ایک طرف دعوتِ دین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ کا کام کرتی ہیں تو دوسری طرف سیاسی میدان میں بھی کام کرتی ہیں تاکہ شریعت نافذ کر سکیں اور مسلمانوں کی دینی اور دنیوی فلاح کا راستہ کھل سکے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی جماعتیں دینی نقطۂ نظر سے مقبول و محمود ہیں۔ دوسری خالص سیاسی جماعتیں، جو صرف سیاسی اہداف کے حصول کے لیے قائم کی گئی ہیں اور جن میں کوئی دینی رنگ نہیں ہوتا بلکہ اُن کے دستور و منشور میں کئی باتیں غیر اسلامی بھی ہوتی ہیں۔

اب اسلامی نقطۂ نظر سے مطلوب تو یہی ہے کہ ان مجرد سیاسی جماعتوں کو بھی اسلام کے نظامِ اجتماعی سے ہم آہنگ کیا جائے اور اُن کو بھی اسلامی بنیادوں پر اُٹھایا جائے اور ان

---

[۱] دکتور عبدالرحمٰن الصابونی، المدخل لدراسۃ التشریع الاسلامی، جلد اوّل ص ۹۹۔ المطبعۃ الجدیدہ دمشق ۱۳۹۹ھ۔

[۲] بلکہ اصل یہ ہے کہ دین و سیاست میں کوئی تفریق ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اسلام میں "دین" کے مفہوم میں سارے دینی اور دنیوی کام شامل ہیں۔

کے منشور اور طریق کار کو بھی اسلام کی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جائے - لیکن عملاً یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ اس کی بظاہر ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ پہلے گروپ کی طرز کی کوئی جماعت برسر اقتدار آئے . اور وہ سیاسی جماعتوں کے نظام کو منضبط کرنے کے لیے ایسے قوانین بنائے کہ ہر سیاسی جماعت کی اُٹھان اسلامی قانون کے مطابق ہو لیکن ایک ایسی دینی اور سیاسی جماعت برسر اقتدار کیسے آئے اس کی دو ہی صورتیں ہیں :-

— قوت اور انقلاب کے ذریعے

— پُر امن طریقے سے -

جس کی واحد صورت یہ ہے کہ اس طرح کی دینی سیاسی جماعتیں پر امن انتقالِ اقتدار کے موجودہ ادارے (انتخابات) میں حصّہ لیں - اگرچہ یہ کام انہیں ناپسند ہی کیوں نہ ہو کیونکہ انتخابات کے موجودہ ڈھانچے میں بہت سی باتیں غیر اسلامی ہیں -

لیکن جب ہمارے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں ایک قوت اور انقلاب کا جو اس لیے قابلِ رد ہے کہ اس میں فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کا امکان غالب ہے تو پھر ہمارے لیے کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہم پر امن راستے کو اختیار کریں خواہ اس میں بھی شرعی نقطہ نظر سے عیب ہوں، لیکن بہر حال یہ قوت کے زور سے انقلاب لانے اور قتل و خونریزی سے تو بہر حال بہتر ہے لہٰذا "اخف الضررین" کے نقطۂ نظر سے بھی دینی سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں حصّہ لینا چاہیے - لیکن دینی جماعتیں اسی پروگرام میں اسی وقت شامل ہو سکتی ہیں اور اس نیک کام کے لیے تگ و دَو کر سکتی ہیں جب کہ سیاسی جماعتوں کا وجود ہو - اور سیاسی جماعتوں کے درمیان شریفانہ مقابلے کی صورت موجود ہو لیکن اگر سیاسی جماعتوں کا وجود ہی نہ ہو اور فوجی حکومت ہو یا سول ڈکٹیٹرشپ تو پھر کوئی دینی اہداف حاصل کرنے کے لیے جمہوری کام کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے - یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کی قابلِ ذکر دینی جماعتوں نے بحالیٔ جمہوریت کی کوششوں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے کیونکہ اگر جمہوریت ہوگی تو وہ بھی اپنی بات کہہ سکیں گے - اور اپنا پروگرام عوام کے سامنے پیش کر سکیں گے - لیکن اگر جمہوریت ہی

اور نہ سیاسی جماعتیں تو دینی کام کرنے کے سارے راستے بھی بند ہو جائیں گے، لہٰذا کام کے راستے بند ہو جانے (یا غلط راستہ کھولنے مثلاً قوت کا استعمال) کی نسبت یہ کہیں قابلِ قبول ہے کہ سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت ہو، خواہ وہ پوری طرح اسلامی معیار اور اہداف کے مطابق کام نہ بھی کر سکیں اور اسی چیز کو ہم نے اخف المضرتین کا نام دیا ہے جو بہر حال ایک شرعی قاعدہ ہے۔

اس وقت تک ہم نے جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے سیاسی جماعتوں کا نظام قابلِ قبول ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ اس مغربی جمہوری نظام کا ایک حصہ ہے۔ جس کی فلسفیانہ بنیادیں غلط اصولوں پر قائم ہیں۔ اور جو اسلام سے متغائر ہیں بشرطیکہ ہم اس کے تفصیلی ڈھانچے کو اپنی ضروریات اور معتقدات کے مطابق ڈھال لیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے نزدیک موجودہ نظاموں میں سے صرف یہی نظام ایسا نظام ہے جس سے ہمارے زمانے میں شریعت کے مقرر کردہ سیاسی اہداف پورے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ کئی اہلِ علم کو ہماری رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے اور ہمارے موقف کی صداقت پر ان کے ذہنوں میں بہت سے شکوک اور سوالات ہو سکتے ہیں لہٰذا ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کے ممکنہ اعتراضات کا ابھی سے جواب دے دیا جائے۔ (اگرچہ بہت سے سوالات کے جوابات بالواسطہ طور پر ہماری اوپر کی بحث میں آچکے ہیں)۔

پہلا اعتراض: سیاسی جماعتیں اقتدار کے حصول کی کوشش کرتی ہیں جب کہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں؟

جواب:۔ اسلام میں اپنی ذات، برادری، قبیلے اور جاہ و حشمت کے لیے اقتدار کی کوشش بلاریب مردود ہے لیکن جب اسلام بحیثیت نظامِ زندگی غالب نہ ہو تو اُسے غالب کرنے کے لیے سیاسی اقتدار کے لیے جدوجہد کرنا عین مطلوب اور محمود ہے اور اس کے لیے ادلہ شرعیہ کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن خالص دینی اغراض سے قطعِ نظر بھی ایک مسلمان معاشرے میں عوام کی اجتماعی، ثقافتی، تعلیمی بھلائی کے لیے کوشش کرنا، غیر ملکی استعمار سے ان کو نجات دلانا (جیسا کہ مسلم ممالک میں کئی سیاسی جماعتوں نے کیا ہے) ان کے لیے ضروریاتِ زندگی

مہیا کرنے کا انتظام کرنا اور ان کے امن و امان اور دفاع کا انتظام کرنا۔ یہ سارے امور محمود ہیں اور ان کے لیے رجال کار کی تیاری بھی محمود ہے اور رجال کار کی موجودگی میں ان نیک مقاصد کے لیے اقتدار کی خواہش بھی عین اسلامی ہے۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو حضرت یوسف کا عزیز مصر سے اقتدار طلب کرنا، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا انصار کے مقابلے میں قریشی مہاجرین کا حق جتانا، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کا اصرار کے باوجود آخر وقت تک خلافت سے دست بردار نہ ہونا۔ نیز حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کی جدوجہد اور امویوں اور عباسیوں کے خلاف سادات کو سیاسی جدوجہد میں مقتدر اور جمہور علما کی حمایت حاصل ہونا (حضرت امام ابوحنیفہ کی حمایت اس کی ایک روشن مثال ہے)۔

ان مثالوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اقتدار طلب کرنا ناجائز ہے اپنی ذات کے لیے اور بالکل جائز ہے نیک، اعلیٰ اور اصلاحی مقاصد کے لیے، اور جب دین کو ملیامیٹ کیا جا رہا ہو اور دینی اقدار کو مٹایا جا رہا ہو تو اس صورت حال کو بدلنے کے لیے اقتدار اور اس کا حصول ضروری ہی نہیں عبادت اور جہاد کی طرح واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایک معقول سوال کی گنجائش ہے اور وہ یہ کہ اگر حقیقت وہی ہے جو ہم نے ابھی بیان کی ہے تو آخر کیوں سلف صالحین میں سے علما و صلحا نے اس طرح کی سیاسی جدوجہد نہیں کی اور درس و تدریس اور وعظ و نصیحت پر اکتفا کرتے رہے۔ اس معقول سوال کا مدلل جواب یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد نظامِ حکومت وراثت میں بدل کر "خلافت" کے نام پر ایک منظم سیاسی ادارے کی شکل اختیار کر گیا اور اس کا بدلنا بظاہر ناممکن ہو گیا اور اس کو بدلنے کی کوشش میں کامیابی کا امکان کم اور قتل و خون ریزی کا امکان زیادہ تھا۔ (اور اس بات کی شدت کا اندازہ اس چیز سے لگایئے کہ حضرت حسینؓ اور عبداللہؓ بن زبیر جیسے لوگ اپنی جانوں کی قربانی دے کر اور عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے لوگ صاحب اقتدار ہوتے ہوئے بھی اس نظام کو نہ بدل سکے)۔ اس لیے علمائے سلف نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس سیاسی ڈھانچے کو بدلنے کے بجائے اس کے اندر رہتے ہوئے تبلیغ و اصلاح کا زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے۔

لیکن آج مسلم نشاۃ ثانیہ کے اِس دورِ نَو میں وہ نظام ختم ہو چکا ہے جسے بدلنے کی اُمت میں طاقت نہ تھی اور جسے علماء اور مصلحین نے بامرِ مجبوری قبول کر رکھا تھا اور آج اس امر کا موقع موجود ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کو از سرِ نو اس کی حقیقی سپرٹ میں، نئے سیاسی ڈھانچے بنا کر نافذ کیا جائے اور اس کے لیے بعض علماء، مصلحین اور ان کی جماعتیں مسلمان ملکوں میں کام کر رہی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے بعض علماء ابھی بسم اللہ کے اسی پرانے گنبد میں بند ہیں اور صرف اسی کو دین کا کام سمجھتے ہیں کہ درس و تدریس اور وعظ و نصیحت پر اکتفا کیا جائے اور سیاست اور سیاسی کام سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ یہ علماء جتنی جلدی اس صورتِ حال کا ادراک کر کے اپنی روش بدلیں گے اور امت کو بھی اپنے ساتھ ملائیں گے اتنا ہی جلدی یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔

دوسرا اعتراض: سیاسی جماعتوں کا نظام تفرقے اور انتشار کا سبب بنتا ہے جب کہ اسلام اخوت و محبت کا علمبردار ہے۔

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے اختلاف کرتی ہیں۔ اور ہر پارٹی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسری کو ہرا کر خود میدان مار لے، لیکن اس کی اصل سپرٹ کھیل کے میدان کی سی ہے اور فریقین بنیادی اور متفق علیہ اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے مقابلے اور اختلاف سے نہ ملک کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے[1] اور نہ اس کے نظریاتی تشخص کو۔ کیونکہ سیاسی جماعت بنانے کی آزادی کا مطلب یہ کہیں بھی نہیں لیا جاتا کہ اسے ملک کی اساس کے خلاف کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ سیاسی جماعتیں اختلاف ضرور کرتی ہیں، لیکن فروعی معاملات میں[2] مثلاً ملک کی

[1] اگر کوئی بیرونی طاقت حملہ کر دے تو معروف جمہوری قاعدہ ہے کہ ساری سیاسی جماعتیں خواہ وہ حکومت کے اندر ہوں یا باہر فوراً ایک قومی پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتی ہیں اور مل کر ملک کا دفاع کرتی ہیں۔

[2] بدوی، النظم السیاسیہ والاجتماعیہ ص ۳۰۰ طبع دار المعارف بمصر ۱۹۵۸ء۔ الطبعۃ الاولیٰ۔

معیشت کو کن خطوط پر استوار کیا جائے؟ نظام تعلیم کیسے بہتر ہو؟ زرعی اور صنعتی پیداوار میں ملک کیسے خودکفیل ہو سکے؟ ملک کے لیے صحیح اور مفید خارجہ پالیسی کیا ہو۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں اختلاف کرنا سودمند تو ہو سکتا ہے نقصان دہ نہیں۔

اور افسوس کی بات یہ ہے کہ مغرب میں (جس کے تتبع میں ہمارے ہاں سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں) تو سیاسی جماعتیں ان ممالک کے لیے نقصان دہ نہیں بلکہ وہ عوام میں یک جہتی پیدا کرتی ہیں، ملک کی ترقی اور خوشحالی کی ضامن ہیں، لیکن ہم نے ان کے تتبع میں جو سیاسی جماعتیں بنائی ہیں وہ ہماری نکبت اور ذلت کا سبب بن گئی ہیں۔ اور ملک جوڑنے کے بجائے توڑتی ہیں۔ اور عوام میں اتحاد کے بجائے افتراق اور نفرت کا سبب بنتی ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کا سبب سیاسی جماعتوں کا نظام نہیں بلکہ اس کے حقیقی ذمہ دار تو ہم خود ہیں جنہوں نے سیاسی جماعتوں کے نظام کو صحیح طریقے پر نہیں چلایا۔ یہ ہم ہیں جنہوں نے جماعتوں کو علاقائی بنیادوں پر کام کرنے کی اجازت دی، ان جماعتوں کو بھی کام کرنے کی اجازت دی جو ملک کے اساسی نظریات کی مخالف ہیں۔ اور ان کو باہر سے ہدایات اور سرمایہ ملتا ہے اور ان کو بھی کام کرنے کی اجازت دی جو لسانی اور فرقہ وارانہ تعصب پھیلاتے ہیں اور ان کو کسی قاعدے اور اخلاق کا پابند نہیں کیا جاتا تو اس کا وہی نتیجہ نکل سکتا تھا جو نکلا، اس سے سیاسی جماعتوں کے نظام میں کیا نقص ثابت ہوتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے نظام کو صحیح اسلامی بنیادوں پر اٹھایا جائے اور ان سے بنیادی اصولوں کی پابندی کروائی جائے (جس کے لیے بعض تجاویز ہم نے دی ہیں) تو یہ نظام خیر و برکت کا سبب بن سکتا ہے اور اس سے ایک مضبوط سیاسی ڈھانچہ وجود میں آسکتا ہے جو وسیع تر دینی اور دنیوی مقاصد کو پورا کر سکتا ہے۔

تیسرا اعتراض:۔ مسلمانوں کے ابتدائی زریں دور اور بعد کی صدیوں میں بھی سیاسی جماعتوں کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ بدعات اور محدثات کی قبیل میں سے ہیں۔

جواب:۔ ہم گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ صحابہ کرام کے زمانے میں بھی سیاسی گروہ بندیاں موجود تھیں۔ اور اس میں وہ ساری خصوصیات موجود تھیں جو آج کی سیاسی جماعتوں

ہیں ہوتی ہیں لیکن ان کی شکل وصورت موجودہ سیاسی جماعتوں جیسی نہ تھی اور ہونی بھی نہیں چاہیے کہ ہمارے اور ان کے عہد میں چودہ سو برس کا فرق ہے اصل اعتبار تو اس اسپرٹ اور بنیادی عناصر کا ہے جو دونوں صورتوں میں موجود ہیں نہ کہ ظاہری شکل کا جو وقت اور زمانے کے ساتھ بدل سکتی ہیں۔[1]

ہمیں تسلیم ہے کہ سیاسی جماعتیں عصرِ حاضر کی پیداوار ہیں۔ لیکن کیا ہر نئی چیز بدعت ہوتی ہے اور قابلِ رد بھی؟ یہ غالباً صحیح نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں دو شرعی قاعدے پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

اوّلاً:۔ جمہور کے نزدیک اشیا میں اصلاً اباحت ہے[2] یعنی ہر چیز اصلاً مباح ہے جب تک اس کی حرمت وکراہت پر کوئی نص یا دلیل نہ ہو۔

ثانیاً:۔ غیر منصوص اور اجتہادی امور میں، زمان ومکان، عرف، مصالح مرسلہ اور مقاصد الشریعہ کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

اور کسی نئی بات میں اوپر ذکر کردہ دو اصولوں سے قطع نظر کرکے جو بھی حکم لگایا جائے گا وہ محلِ نظر ہوگا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سیاسی جماعتوں کا نظام اگرچہ جدید ہے لیکن صرف جدید ہونے کی بنا پر اس پر "غیر شرعی" کا فتویٰ نہیں جڑا جاسکتا کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کے وجود کے بغیر آج کے سیاسی نظام میں شریعت کے مقاصد پورے نہیں ہوسکتے، نیز ان سے مسلمانوں کے بہت سے دینی اور دنیاوی مصالح وابستہ ہیں اور مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کے موجودہ دور میں جہاں بھی انہیں آزادی سے کام

[1] جیسا کہ پروفیسر سارتوری کہتے ہیں کہ کل ماضی کے سیاسی جتھے آج سیاسی جماعتوں کی صورت اختیار کرچکے ہیں ملاحظہ ہو۔

PARTIES & PATY SYSTEMS BY PROF G SARTORY P. 58

[2] دکتور محمد سلام مدکور، نظریۃ الاباحۃ عند الاصولیین والفقہاء ص ۳۳۵ دار النہضۃ العربیۃ ۱۹۶۵ء۔

کرنے کا موقع ملا ہے انہوں نے سیاسی جماعتوں کا نظام اپنایا ہے لہٰذا یہ ایک طرح ہمارا عرف بھی بن چکی ہیں۔ ان حالات میں سیاسی جماعتیں جدید ہونے کے باوجود شرعی نقطہ نظر سے قابل قبول ہیں اور ضروری بھی اور اگر لفظ بدعت ہی پر اصرار ہو تو پھر انہیں "بدعت حسنہ" کہہ لیجیے۔

چوتھا اعتراض: مغرب میں سیاسی جماعتیں وہاں کے مخصوص حالات کی پیداوار ہیں اور اسلام کے سیاسی نظام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں، جو لوگ ان کی حمایت کرتے ہیں وہ مغرب کی اندھی پیروی کرتے ہیں اور مغربی تہذیب سے مرعوب ہیں۔

جواب: سیاسی جماعتوں کے نظام کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ چونکہ مغربی استعمار نے اس نظام کو پہلے اپنایا ہے اور ہماری اس سے دشمنی ہے لہٰذا ہم اس پر لعنت بھیجتے ہیں، بلکہ ہمیں اس کو اس اسپرٹ میں لینا چاہیے کہ ایسے اداروں کا قیام انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے کیونکہ یورپ میں بھی عوام اپنی قوتوں کو (سیاسی جماعتوں کی صورت میں) اس لیے جمع کرنے پر مجبور ہوئے کہ انہیں مطلق العنان بادشاہوں کا سامنا تھا۔ اور ہم بھی ان سیاسی جماعتوں کے نظام کو اس لیے اپنے معاشرے کے لیے مفید سمجھ رہے ہیں کہ ہم بھی سیاسی استبداد کے ستائے ہوئے ہیں (ماضی میں بھی اور حال میں بھی) اور عوام کی طاقت کو سیاسی اور انتظامی ظلم سے بچنے کے لیے مجتمع اور منظم کرنا عین اسلامی حرکت ہے اور مباح کے درجے سے بڑھ کر مندوب اور محمود ہے بلکہ ظلم کا مقابلہ کرنا تو جہاد کے مترادف ہے اور واجب بھی۔

مغرب سے نفرت بجا لیکن اس نفرت کا یہ مطلب بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ہم تعصب میں وہاں کی ہر اچھائی کی نفی کر دیں۔ حکمت تو مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں سے بھی ملے۔ اس معاملے میں اسلامی شریعت سے ہمیں یہ اصولی رہنمائی ملتی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اور اس کی رہنمائی میں اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کی ہر چیز کو یہ کہہ کر رد نہیں کر دیا کہ یہ تو کافروں کا چلن ہے، جاہلیت کا نظام ہے بلکہ جو چیزیں اس میں صحیح تھیں، فطرت کے قریب تھیں اور اسلامی نظام کا مزاج اُن کو قبول کر سکتا تھا، اسلام نے اُن کو برقرار رہنے دیا (مثلاً عائلی زندگی میں منگنی، خطبہ نکاح، کفو ہونا، مہر مقرر کرنا، طلاق کا حق مرد کے ہاتھ میں ہونا، نظام وراثت میں نسبت کی رشتہ داری کا لحاظ، عقوبات میں قصاص اور قتل خطا میں دیت کے نظام کو برقرار رکھنا اس

کی چند مثالیں ہیں) خود صحابہ کرام کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے دواوین مرتب کرنے کا حکم دیا جو فارسی نظام کا ایک حصہ تھا اور انہیں مفتوحہ ممالک کی زبان میں لکھا جاتا تھا، اسی طرح سکے ڈھالنے کا کام ہوا جو عربوں میں نہیں ہوتا تھا، خراج کے نظام کو اپنایا جو کسرای نوشیروان کا جاری کردہ تھا۔ لیکن کسی صحابی نے اس پر کبھی یہ کہہ کر اعتراض نہیں کیا کہ ہمیں یہ قبول نہیں کیوں کہ یہ غیر ملکی تہذیب کا ایک حصہ ہے، کیوں کہ اس سے مسلمانوں کے مصالح کی حفاظت مقصود تھی اور کسی منصوص حکم کی خلاف ورزی کا پہلو بھی اس میں نہ تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم مغرب کے اندھے مقلد بن جائیں اور ہر بات میں اُن کی نقل کرنا شروع کر دیں۔ یقیناً ہمیں وہاں سے نظریات درآمد نہیں کرنے ہیں اور اس سلسلے میں بہتر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی ایک عمومی قاعدہ بنانے کے بجائے جو معاملہ بھی ہمارے سامنے پیش ہو اس پر انفرادی طور پر غور کر لیں کہ یہ ہمارے نظامِ زندگی سے ہم آہنگ ہے اور اس سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ گویا ہم ہر بات کو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی میزان میں تولیں۔ ہر وہ عقیدہ اور ڈھانچہ جو اسلامی شریعت اور اس کے مقاصد کی نفی کرتا ہے، وہ بلا ادنیٰ تردد مردود ہے لیکن اگر وہ مباحات میں سے ہو، ہمارے عصری حالات کے مطابق ہو اور اس سے مسلمانوں کے مصالح کی حفاظت میں مدد مل سکتی ہو (اس میں تھوڑے بہت تغیر کے بعد) تو اس کے اختیار کرنے میں کوئی عیب نہیں ہونا چاہیے اور اسے صرف مغرب دشمنی کے تعصب میں آکر رد نہیں کر دینا چاہیے۔

اور اگر ہم ذکر کردہ اس اُصول کا اطلاق مغرب کے جمہوری اور سیاسی نظام پر کریں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ من حیث النظریہ مغرب کا جمہوری نظام فاسد فلسفیانہ بنیادوں پر کھڑا ہے اور ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہے لیکن عملی نقطۂ نظر سے اس نظام کے بعض اجزا ایسے بھی ہیں (جو معمولی ردوبدل کے بعد) ہمارے حالات کے مطابق بھی ہیں اور ہمارے اپنے نظریات و معتقدات کے خلاف بھی نہیں ہیں[1]۔ مثلاً انتخابات کا نظام یا سیاسی جماعتوں

[1] کیونکہ پارلیمنٹ، انتخابات اور سیاسی جماعتوں جیسے اداروں سے (باقی بر صفحہ آئندہ)

کا نظام[1] وغیرہ تو ایسے عملی ڈھانچوں کو ضروری رد و بدل کے ساتھ اختیار کرنے میں شرعی نقطہ سے کیا عیب ہوسکتا ہے؟ خاص طور پر اگر ہم یہ بھی اپنے ذہن میں رکھیں کہ ہم خود ۔ یعنی مسلمان امت ۔ پچھلی صدیوں میں اجتماعی اور سیاسی حالات کے دباؤ کی وجہ سے کوئی مناسب سیاسی ادارے قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

پانچواں اعتراض: سیاسی جماعتوں کا نظام بہت سی قباحتوں اور فتنوں کا سبب ہے مثلاً انتخابات میں تنازعات اور تفرقہ بازی، جھوٹے الزامات کی بھرمار، ووٹوں کی خرید و فروخت، پارلیمنٹوں کے اندر اور باہر اختلاف برائے اختلاف وغیرہ اور یہ سب امور شریعت میں مردود ہیں۔

جواب: ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اس طرح کی ساری قباحتیں اس وقت ہمارے ہاں موجود ہیں لیکن اگر ہم ذرا سا بھی غور کریں تو ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ برائیاں اس نظام کا خاصہ نہیں ہیں بلکہ اس نظام کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں اور ثبوت اس کا یہ ہے کہ اس قسم کی خرابیاں یورپ و امریکہ میں بہت کم ہیں، یہ خرابیاں دراصل نظام میں نہیں بلکہ ہم میں ہیں اور مناسب قواعد و ضوابط وضع کرکے اور ان پر سختی سے عمل درآمد کرکے ان برائیوں سے ہم بڑی آسانی سے نجات پا سکتے ہیں۔

علاقے، نسل، برادری، قبیلے اور فرقے کی بنیاد پر ووٹ مانگنے منع کر دیجیے، جو غلط الزام لگائے اسے عدالت میں لے جا کر کوڑے لگوائیے، ووٹوں کی خرید و فروخت کرنے والوں کو جیلوں میں ڈالیے، ایک خاص حد سے زیادہ سرمایہ لگانا ممنوع ہو، پارلیمانوں کے اندر حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی مصنوعی تقسیم کو ختم کر دیجیے۔ غرض یہ کہ نظام کے غلط استعمال سے جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوں اس کے لیے مناسب قانون وضع کرکے اور اس پر سختی سے عمل درآمد کرواکر ہم تسلی بخش نتائج حاصل کرسکتے ہیں۔

پھر اس اختلاف اور جان و مال کے ضیاع کو جو جمہوری طریق کار میں ہوتا ہے، اخف الضررین

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اسلام کے کسی عقیدے کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس یہ شوریٰ اور احتساب کی ایک عملی صورت مہیا کرتے ہیں بشرطیکہ ہم اس کے بعض شکلی اور بے ضرر امور میں تبدیلی کرلیں۔

[1] کیونکہ یہ امور مباحات میں سے ہیں اور ان سے مسلمانوں کے دینی اور دنیوی مصالح کا تحفظ ہوسکتا ہے۔

کے نقطۂ نظر سے بھی سوچنا چاہیے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انتخابات میں بلاشبہ کچھ اختلافات اُبھرتے ہیں، مال و دولت خرچ ہوتے ہیں اور جھگڑوں میں چند ایک جانیں چلی جاتی ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غور فرمایئے کہ اگر اس طرح کے نظام کو ختم کر دیا جائے تو پھر سیاسی تبدیلی لانے کے لیے کتنی خونریزی ہوگی[1] جان و مال کا کتنا ضیاع ہوگا، ماضی کی طرف دیکھنا ہو تو تاریخ کی کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھیے کہ جب امویوں کو ختم کر کے عباسی سلطنت قائم ہوئی تو کس طرح کشتوں کے پشتے لگے اور ایران کا انقلاب اس کی تازہ ترین مثال ہے بلکہ خود پاکستان میں ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں جان و مال کا کتنا معمولی نقصان ہوا ہوگا۔ لیکن جب بھٹو صاحب نے طاقت کے ذریعے تبدیلی کا راستہ روک دیا تو پھر تبدیلی لانے کے لیے نظامِ مصطفیٰ کی تحریک چلی تو جان و مال کا کتنا ضیاع ہوا؟ تو ہماری اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ انتخابات اور سیاسی جماعتوں کے ذریعے جو تبدیلی آتی ہے اور اقتدار ایک ہاتھ سے دوسرے کو منتقل ہوتا ہے تو اس میں کسی متبادل طریقے کی نسبت جان و مال کا سب سے کم ضیاع ہوتا ہے اس لیے یہ نظام قابلِ قبول ہے۔

اوپر ذکر کردہ سارے دلائل کا لب لباب اور بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کا نظام اسلامی قانون کے مزاج کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس میں معمولی ردو بدل کر کے ہم اسے اپنے کام میں لا سکتے ہیں اور نہ صرف یہ، بلکہ ہم اس سے آگے بڑھ کر یہ کہیں گے (اور اس کے لیے ہم نے دلائل دیے ہیں) کہ عصر حاضر میں صرف یہی نظام ہے جس کو اپنا کر ہم اسلامی روح کے مطابق شوریٰ، آزادی اور عدل و مساوات کے منصوص سیاسی احکام پر عمل درآمد کر سکتے ہیں اور اس راستے کو چھوڑ کر سر راستہ آمریت اور استبداد کی طرف جاتا ہے خواہ وہ ایک جماعتی نظام ہو یا غیر جماعتی نظام ہو یا بادشاہی نظام ہو یا فوجی نظام ہو۔ والعلم عند اللہ۔

معذرت:- ہمیں افسوس ہے کہ اس مضمون کے مؤلف کا نام پچھلی مرتبہ محمد دین چھپ گیا۔ صحیح نام محمد امین ہے۔ (ادارہ)

---

[1] ڈاکٹر محمد طٰہٰ بدوی و محمد طلعت الغنیمی، النظم السیاسیۃ والاجتماعیۃ ص ۲۵۹ مرجع سابق۔

اِسلامی سزاؤں کا عقلی جائزہ

پروفیسر سیّد محمد سلیم صاحب

ایک بڑے درخت کو دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں، کہتے ہیں کتنا بھلا لگتا ہے، کتنا سایہ دار ہے، کس قدر پھل دیتا ہے۔ عام آدمی کی نگاہ بس یہاں تک جاتی ہے۔ حقیقت بیں نگاہ گہرائی میں اتر کر دیکھتی ہے کہ یہ حسن وخوبی کن اسباب کی بنا پر ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ اس درخت کے ایک جڑ ہے، جو زمین سے اس کو غذا اور پانی مہیا کرتی ہے۔ اس درخت کے ایک تنا ہے جو درخت کے پھیلاؤ کا بوجھ برداشت کیے ہوئے ہے، جس پر پھل لگتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں۔ اگر جڑ نہ ہوتی، اگر تنا نہ ہوتا تو پھر نہ پھول کھلتے اور نہ پھل لگتے۔ ساری اہمیت جڑ اور تنا کی ہے۔

ایک وسیع اور عالیشان عمارت کو دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں۔ اس کی بلندی، اس کا استحکام اور اس کی خوشنمائی پر سب تعجب کرتے ہیں۔ اس کے بالاخانے آرام دہ ہیں اور پُرسکون ہیں۔ بیسیوں خاندانوں کو اپنے دامن میں گوشۂ عافیت مہیا کیے ہوئے ہیں۔ عام آدمی تو بس یہ دیکھتا ہے لیکن حقیقت بیں نگاہوں پر یہ امر ظاہر ہے کہ اس عمارت کی بنیادیں بہت گہری ہیں۔ اس کی تعمیر میں اچھے قسم کا مسالہ لگایا گیا ہے۔ اس کی تعمیر کا نقشہ بہت آرام دہ اور موزوں ہے۔ اس کو حسین اور خوبصورت بنایا گیا ہے۔ کہیں اگر بنیادیں گہری نہ ہوتیں، مسالہ اچھا نہ ہوتا، دیواریں مضبوط نہ ہوتیں، کمرے آرام دہ نہیں ہوتے تو پھر یہ سینکڑوں افراد اس کی گود میں پُرسکون رہائش سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے تھے۔

دُنیا میں آج سینکڑوں اقوام آباد ہیں۔ ہزاروں معاشرے موجود ہیں، یہ معاشرے تہذیب و تمدن